"نظریے کے بغیر تخلیقی ادب بالکل بے معنی ہو جاتا ہے"

احمد ندیم قاسمی

اشفاق: خواتین و حضرات۔ ہماری یہ خوش قسمتی ہے کہ احمد ندیم قاسمی صاحب نے ہماری دعوت قبول کی اور آج یہاں تشریف لائے۔ آج کانفرنس کے دوران آپ نے قاسمی صاحب کی شخصیت اور فن پر بہت پرمغز مقالات سنے۔ آخر میں ہماری خواہش ہے کہ ہم قاسمی صاحب سے کچھ سوالات پوچھیں تاکہ ان کے بارے میں مزید جان سکیں۔

قاسمی صاحب! اس شام خالد سہیل، میں اور بیدار بخت آپ سے چند سوال پوچھیں گے۔ تو سب سے پہلے میں خالد سہیل سے کہوں گا کہ وہ آپ سے سوال پوچھیں۔

سہیل: قاسمی صاحب! میری خواہش ہے کہ گفتگو کا آغاز آپ کے بچپن سے ہو۔ آپ نے مدتوں پہلے اپنے بچپن کے بارے میں لکھا تھا "مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مدرسے جانے سے پہلے میرے وہ آنسو بڑی احتیاط سے پونچھے جاتے تھے جو اماں سے محض ایک پیسہ حاصل کرنے میں ناکامی کے دکھ پر بہہ نکلتے تھے لیکن میرے لباس کی صفائی، میرے بستے کا ٹھاٹھ

اور میری کتابوں کی "گیٹ اپ" کسی سے کم نہ ہوتی تھی۔ گھر سے باہر احساس برتری رہتا تھا اور گھر میں داخل ہوتے ہی وہ سارے آبگینے چور ہو جاتے تھے جنھیں میری طفلی کے خواب تراشتے تھے پیاز یا سبز مرچ یا نمک مرچ کے مرکب سے روٹی کھاتے وقت زندگی بڑی سفاک معلوم ہونے لگتی تھی والد گرامی پیر تھے یاد الٰہی میں کچھ ایسی استغراق

کی کیفیتیں طاری ہونے لگیں کہ مجذوب ہو گئے"

قاسمی صاحب! اب جب آپ مڑ کر بچپن کی طرف دیکھتے ہیں تو کیا محسوس کرتے ہیں؟

قاسمی: میں ایک نہایت ہی شریف گھرانے کے نہایت ہی غریب خاندان میں پلا بڑھا۔ اس کی وجہ ابھی آپ کو پڑھ کر سنا دی گئی ہے۔ میرے والد یادِ الٰہی میں اس درجہ مستغرق رہتے تھے کہ معاشی معاملات کی طرف توجہ نہ دے سکتے تھے۔ فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ والدہ محترمہ بڑی کفایت شعاری سے ہمارا خیال رکھتی تھیں اس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں سکول میں دواتوں میں سیاہی استعمال کرنے کے لیے ایک پیسے کی سیاہی خریدنی پڑتی تھی۔ وہ ایک پیسہ کہاں سے آئے۔ چنانچہ والدہ توے کی کالک اتارتی تھیں اور اسے حل کر کے دوات میں ڈال دیتی تھیں۔

اشفاق: قاسمی صاحب! آپ یہ بتائیں کہ آپ کے خاندان کے افراد نے آپ کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں کس قسم کا کردار ادا کیا؟

قاسمی: میرے ایک چچا تھے جن کا نام پیر حیدر شاہ تھا وہ اسسٹنٹ کمشنر ہوا کرتے تھے وہ خود بے اولاد تھے انہوں نے مجھے، میرے بڑے بھائی اور چچازاد بھائیوں کو اپنے ہاں بلایا اور تعلیم دلوائی۔ اس طرح ہم اس قابل ہوئے کہ زندگی کی مشکلات سے نپٹ سکیں۔ اگر ان کا وجود نہ ہوتا تو ہم شاید چوتھی یا مڈل سے آگے نہ پڑھ سکتے زیادہ سے زیادہ ہائی سکول پاس

کر لیتے اور پٹواری وغیرہ بن جاتے۔

بیدار: یہاں یہ سوال اٹھتا ہے قاسمی صاحب کہ آپ کی خاندانی زندگی نے آپ کی ادبی شخصیت کو کیسے متاثر کیا اور آپ کی ادبی شخصیت نے آپ کی خانگی زندگی پر کیا اثر ڈالا۔

قاسمی: میری ادبی زندگی نے تو میری خانگی زندگی پر کوئی اثر نہیں ڈالا اس لیے کہ میرا خاندان ادب پڑھتا ہی نہیں تھا۔ (سامعین میں قہقہے)

میری شخصیت سازی میں جو کردار میرے چچا نے ادا کیا جس کا ابھی میں نے ذکر کیا وہ بھرپور تھا۔ میں نے چوتھی جماعت کا امتحان پاس کیا تو ریل گاڑی میں بیٹھ کر چچا کے پاس چلا گیا وہ ان دنوں اٹک کے پاس رہتے تھے۔ وہاں پانچویں جماعت سے سکول شروع کیا اور باقی بھائیوں کے ساتھ تفسیر قرآنی پڑھنی شروع کی۔ انھوں نے ہمیں تفسیر حقانی پڑھائی جو مولانا عبدالحق محدث دہلوی کی لکھی ہوئی تھی اس میں مجھے اب تک یاد ہے سر سید مرحوم کو بہت برا بھلا کیا گیا تھا اور انہیں 'نیچری' کہہ کر پکارا گیا تھا۔ مجھے یہ کرید رہتی تھی کہ آخر مولوی صاحب کو کیا تکلیف ہو گئی ہے۔ بہرحال میں نے وہاں دینی تعلیم حاصل کی۔

اس کے علاوہ چچا کے ہاں اس دور کے ادبی رسالے بھی آیا کرتے تھے جن میں نیاز فتح پوری کا "نگار" بشیر احمد کا "ہمایوں" اور "صوفی" جیسے رسالے شامل تھے۔ "صوفی" رسالہ تصوف کا تھا لیکن اس میں جوش ملیح آبادی کی ایک نظم ہمیشہ شامل ہوتی تھی۔ جوش صاحب سے ان کے تعلقات قریبی تھے۔ اس رسالے میں اس قسم کی نظمیں چھپتی تھیں واعظ کے بارے میں شعر تھا۔

خدا کو اور نہ پہچانیں یہ حضرت
خدا کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں

(سامعین میں قہقہے)

مجھے اپنے چچا کے ہاں علامہ مشرقی کی ایک کتاب بھی ملی جو میں نے پڑھ ڈالی یہ علیحدہ بات کہ مجھے سمجھ نہ آئی۔ میرے چچا سرکاری افسر تھے اور ان دنوں سرکاری افسر انگریزوں کے خلاف ذرا کم ہی بات کر سکتے تھے لیکن میرے چچا اس مزاج کے تھے کہ میرے ساتھ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور مولانا ظفر علی خان کے بارے میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ اس گفتگو سے میرے اندر یہ امنگ پیدا ہوئی کہ یہ غیر ملکی جو ہم پر آکر مسلط ہو گئے ہیں۔ اور غیر ملکی بھی کوئی اڑوس پڑوس کے نہیں سات سمندر پار کے جب میرا بس چلا تو ان کے خلاف لکھوں گا۔

بیدار: آپ نے لکھنا کب شروع کیا؟

قاسمی: دسویں جماعت کا ابھی میں نے امتحان نہیں دیا تھا ۱۹۳۱ء کی بات ہے جنوری کا مہینہ تھا۔ خبر آئی کہ مولانا محمد علی جوہر کا لندن میں انتقال ہو گیا ہے۔ وہ وہاں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے تھے ان کی ایک تقریر اخباروں میں چھپی تھی جس میں انہوں نے کہا تھا کہ میں آزادی لے کر جاؤں گا میں غلام ہندوستان میں واپس نہیں جانا چاہتا۔

میں اس واقعہ سے بہت متاثر ہوا میں ان دنوں چودہ پندرہ سال کا لڑکا تھا۔ میں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ جب بڑے بڑے رہنما فوت ہوتے ہیں تو نوحے اور مرثیے لکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ میں بھی ایک نوحے کی کوشش کروں۔ میں نے ایک نظم لکھی اور چچا جان کو دکھائی۔ وہ خاصے خوش ذوق تھے وہ شاعری کی بحور اور قوافی وغیرہ سے واقف تھے کہنے لگے اس کا وزن بھی ٹھیک ہے ردیف قافیہ میں بھی کوئی غلطی نہیں ہے۔ وہ بہت خوش ہوئے مجھے بہت پیار کیا۔ وہ نظم لے کر لاہور چلے گئے۔ ان دنوں لاہور سے ”سیاست“ کے نام سے ایک روزنامہ نکلا کرتا تھا جو کافی معروف تھا۔ سید حبیب اس کے ایڈیٹر ہوا کرتے تھے۔ میرے چچا نے

وہ نظم انہیں دے دی انہوں نے وہ نظم پہلے صفحے پر چھاپ دی۔ ان دنوں تصویریں نہیں ہوا کرتی تھیں سنڈے ایڈیشن میں پہلے صفحے پر رنگ وغیرہ بکھیرے ہوتے تھے میری نظم ان رنگوں کے ساتھ چھپی۔ شاید وہ نظم اس لیے بھی چھپی کہ میں ایک بڑے سرکاری افسر کا بھتیجا تھا کیونکہ وہ میری بہت ہی ابتدائی نظم تھی۔ اس نظم کی کاپی میرے پاس نہیں ہے میں کوشش کر رہا ہوں کہ اگر لاہور کی کسی لائبریری سے وہ اخبار مل جائے تو میں وہ نظم نقل کرلوں۔ بہرحال وہ میری پہلی نظم تھی۔

اشفاق: قاسمی صاحب! آپ نے زندگی کا بیشتر حصہ لاہور میں گزارا ہے ۱۹۴۷ء سے پہلے کا لاہور اردو کا بہت بڑا مرکز ہوا کرتا تھا اور اب بھی ہے لیکن اس دور کے لاہور میں ایسی شخصیات جمع ہو گئی تھیں جن سے مل کر قریب بیٹھ کر ادب کا ذوق نہ پیدا ہونا ناممکن تھا قاسمی صاحب آپ ۱۹۴۷ء سے پہلے کے لاہور کے بارے میں کچھ بتائیں کیونکہ اس کا تعلق آپ کی ابتدائی زندگی سے بھی ہے۔

قاسمی: ان دنوں شعروادب کی دنیا میں جو بڑی بڑی شخصیات تھیں ان میں علامہ اقبال، مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبدالمجید سالک، پطرس بخاری، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، عابد علی عابد، احسان دانش شامل تھے ان کے علاوہ چغتائی اور اللہ بخش جیسے فنکار بھی موجود تھے۔ ان سب سے ملاقات کا شرف تو مجھے حاصل ہوا لیکن ایک مبتدی کی حیثیت سے کیونکہ میں سکڑا سکڑا بیٹھا رہتا تھا۔

علامہ اقبال سے بھی ایک دفعہ ملاقات ہوئی۔ مولانا سالک اور مولانا چراغ حسن حسرت نے مجھ سے پوچھا "کیا تم علامہ اقبال سے کبھی ملے ہو؟" میں نے کہا "میری مجال کہ میں ان سے جا کر ملوں"۔ کہنے لگے "چلو ہم تمہیں لے چلتے ہیں" وہ مجھے لے جا رہے تھے کہ راستے میں اختر شیرانی مل گئے

جو تانگے پر جا رہے تھے انہوں نے سالم تانگہ لے رکھا تھا اور پچھلی سیٹ پر پاؤں پھیلائے بیٹھے تھے وہ بڑے مہذب انسان تھے انہوں نے تانگہ رکوایا اور پوچھا "کہاں تشریف لے جا رہے ہیں"۔ مولانا سالک نے کہا " علامہ کے ہاں جا رہے ہیں"۔ کہنے لگے " آیئے میں آپ کو وہاں پہنچا دوں" ہم تانگے پر بیٹھ گئے۔ اگلی سیٹ پر دونوں حضرات بیٹھ گئے اور میں اختر شیرانی کے پاس پیچھے بیٹھ گیا۔ اختر شیرانی سے میرا تعارف بھی تھا اور عقیدت بھی۔ مجھ سے آہستہ سے کہنے لگے۔ تم کہاں پھنس گئے۔ (سامعین میں قہقہے)

علامہ کے گھر گئے تو وہ باہر لان میں استراحت کر رہے تھے نیم دراز تھے حقہ پی رہے تھے دھوتی اور بنیان پہن رکھے تھے گرمیوں کا موسم تھا۔

گفتگو شروع ہوئی تو مولانا کی مبالغہ آمیزی کی طرف مڑ گئی علامہ کہنے لگے کہ ایک دفعہ وہ میرے پاس تشریف لائے اور کہنے لگے کہ میں نے پوری دنیا میں اسلام پھیلانے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس کا طریقِ کار یہ ہوگا کہ اس وقت پورے کرہ ارض پر پچاس کروڑ مسلمان آباد ہیں اگر ہر مسلمان ایک ایک روپیہ دے تو اسی سے پچاس کروڑ جمع ہو جائیں گے اس رقم سے اسلام پھیلایا جائے گا۔ علامہ نے کہا " مولانا! اس پچاس کروڑ روپے جمع کرنے کے لیے بھی تو ایک کروڑ روپیہ چاہیئے۔ (سامعین میں قہقہے)

مولانا کہنے لگے " اس کا تو مجھے خیال ہی نہیں آیا"

علامہ اقبال اور مولانا سالک کے درمیان طویل گفتگو ہوتی رہی میں سکڑا سمٹا بیٹھا رہا مولانا سالک نے تعارف بھی کروایا کہ یہ بھی شعر کہتا ہے ذہین لڑکا ہے۔

پون گھنٹے کی گفتگو کے بعد علامہ مولانا چراغ حسن حسرت کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا " حسرت صاحب! آپ کیا سوچ رہے ہیں" کہنے لگے " میں آپ کے حقے کی خودی پر غور کر رہا ہوں" (سامعین میں قہقہے)

وہ میری علامہ سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔

اسی طرح غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک سے بھی رسالہ انقلاب کے دفتر میں ملاقاتیں ہوئیں۔ سالک تو میرے رہنما تھے۔ مولانا غلام رسول مہر بھی بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ پطرس بخاری سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا۔ اس دور کے جتنے بھی بزرگ تھے وہ اپنے سے چھوٹوں اور کم عمر ادیبوں کی بڑی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے ان سے شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ مولانا عبدالحق مرحوم بابائے اردو میں بھی یہ صفت تھی میں نے جب بھی کوئی رسالہ نکالا یا مدیر بنا تو انہوں نے لمبا خط لکھ کر حوصلہ افزائی کی

سہیل : قاسمی صاحب! آپ غزلیں بھی لکھتے ہیں نظمیں اور افسانے بھی تخلیق کرتے ہیں ــــــ قمر رئیس صاحب نے اپنے مضمون میں اس ماں کی مثال دی جس کے بہت سے بیٹے اور بیٹیاں ہوں۔ کیا آپ کو ایک صنف دوسری سے زیادہ مرغوب ہے یا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک صنف میں آپ اپنے مافی الضمیر کا بہتر اظہار کر سکتے ہیں۔

قاسمی : یہ میری شعوری کوشش نہیں ہوتی کہ میں افسانہ لکھوں، غزل لکھوں یا نظم کہوں یا مضمون لکھوں۔ تنقیدی مضمون میں گرچہ شعوری کوشش کا دخل ہو جاتا ہے۔ جب کوئی خیال میرے ذہن میں آتا ہے تو لکھنے بیٹھ جاتا ہوں بعض دفعہ نظم لکھنے بیٹھتا ہوں تو افسانہ لکھ ڈالتا ہوں اور کئی دفعہ افسانہ لکھنے بیٹھتا ہوں تو چند سطروں کے بعد اسے کاٹ دیتا ہوں اور ایک سطر سوجھتی ہے جو آہستہ آہستہ ایک نظم بن جاتی ہے۔

یہ سب میری ایک شخصیت کے مختلف پہلو ہیں جیسے انسان کھاتا بھی ہے پیتا بھی ہے روتا بھی ہے سوتا بھی ہے سب کچھ کرتا ہے۔ اسی طرح میں افسانہ بھی لکھتا ہوں، غزل بھی، نظم بھی۔

بعض دفعہ یوں بھی ہوا کہ نظم لکھنے بیٹھا اور چھوٹا سا افسانہ میرے ذہن

میں آ گیا اور میں نے اسے منظوم کر دیا۔

بیدار: میں کبھی کبھار سوچتا ہوں کہ کیا کوئی انسان اتنے تجربات سے گزر سکتا ہے جتنا آپ نے لکھا کیا آپ کی تخلیقات ذاتی تجربات پر مبنی ہوتی ہیں یا مشاہدات پر۔

مثلاً صبوحی کیا گوشت پوست کا پیکر ہے یا تخیل کا ایک کارنامہ؟

قاسمی: صبوحی تو ایک فیشن کا نام تھا۔ ان دنوں اختر شیرانی نے سلمٰی کا نام استعمال کرنا شروع کیا ایک اور شاعر نے ریحانہ کا نام چنا۔ کسی نے عذرا کا۔ میں نے سوچا میری بھی کوئی ہونی چاہیئے۔ چنانچہ میں نے صبوحی کا نام چُن لیا۔ (سامعین میں قہقہے اور ایک سوال)

قاسمی صاحب! آپ نے اپنی اصلی محبوبہ کا نام پوشیدہ کیوں رکھا؟

قاسمی: میں نہ کینیڈا کا رہنے والا ہوں نہ امریکہ کا۔ میں پاکستان کا رہنے والا ہوں۔ وہاں محبوبہ کا نام لے کر نہیں بتایا جاتا۔ چھپ چھپ کر بات کی جاتی ہے۔

ویسے میں یہ کہہ دوں کہ جو شخص محبت نہیں کر سکتا وہ شعر بھی نہیں کہہ سکتا۔ محبت تو میں نے کی ہے لیکن آپ کو اس کی تفصیل نہیں بتا سکتا۔

اشفاق: آپ سے جو سوال کیا گیا اس کا تعلق آپ کے معیارِ اخلاق سے ہے میرے خیال میں لوگوں نے آپ کو ایک حد تک مصلوب کیا ہے۔ 'افکار' کے 'ندیم نمبر' میں زیادہ تر لوگوں نے کہا ہے کہ آپ اچھے شاعر ہیں اچھے افسانہ نگار ہیں لیکن شریف آدمی زیادہ ہیں۔ بہت سے لوگوں نے اس بات پر آپ کو ہدفِ ملامت بھی بنایا۔ نئی نسل کی ایک شاعرہ نے کہا کہ ندیم صاحب سے کیا گفتگو ہو گی ان کے سامنے HOMOSEXUALITY کا ذکر کریں تو ان کی بھنویں تن جاتی ہیں۔ خدیجہ مستور نے اپنے مضمون میں لکھا کہ کسی نے کہا ہے قاسمی بھی بھلا کوئی شاعر ہے۔ ہر عورت کو

بہن کہتا ہے اور سمجھتا بھی ہے۔

اس سلسلے میں آپ کی شاعری میں بھی اشارے ملتے ہیں۔

لوگ کہتے ہیں بروں کو بُرا
کتنا اچھا ہوا بُرا ہونا

یہ شعر شاید انہی سوالوں کے پس منظر میں کہا گیا ہے۔

تو قاسمی صاحب! آپ یہ بتائیں کہ آج سے پچاس سال پہلے آپ نے جو معیارِ اخلاق اپنے لیے متعین کیا تھا آپ نے ان بزرگوں کا حوالہ بھی دیا ہے جن کی صحبت میں آپ نے وقت گزارا ہے اس معیار میں کیا کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے؟

قاسمی: میرے معیارِ اخلاق میں تو کوئی تبدیلی واقع ہو ہی نہیں سکتی۔ البتہ آج کے بزرگوں کے معیارِ اخلاق میں بہت تغیر واقع ہو چکا ہے میں نے اپنی ایک نظم میں لکھا تھا۔

ساری دنیا میرا کعبہ سب انسان میرے مہمان
دشمن بھی تو دو اِک تھے دشمن بھی تو تھے انسان

میرے مخالفین بھی بہت سے ہیں میرے خلاف مضامین بھی لکھتے ہیں لیکن ان میں سے نوے فی صد معافی مانگ لیتے ہیں اور میں معاف کر دیتا ہوں۔ یہی میرا معیارِ اخلاق ہے سوچتا ہوں عین ممکن ہے میرے معاف کرنے سے میرے مخالف کی شخصیت میں ایسا تغیر پیدا ہو کہ آئندہ وہ اس قسم کی حرکت کسی اور کے ساتھ نہ کرے۔

(سامعین میں سے عقیلہ شاہین کا سوال)

"قاسمی صاحب! آپ ایک طویل عرصے سے عوام میں تبدیلی لانے کی کوشش کر رہے ہیں جہاد کر رہے ہیں میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ کیا آپ نے اس کے اثرات معاشرے میں دیکھے ہیں کیا آپ نے خوشگوار

ہوا کا کوئی جھونکا محسوس کیا ہے۔

قاسمی: عرض یہ ہے کہ میں نصف صدی سے لکھ رہا ہوں شعر بھی افسانہ بھی اخباری کالم بھی لیکن آج بھی میری جو کتاب چھپتی ہے وہ ایک ہزار کی تعداد میں چھپتی ہے۔ گیارہ کروڑ کی آبادی میں ایک ہزار کی تعداد اور وہ بھی تین سال میں بکتی ہے۔ اگر ہم یہ بھی سمجھ لیں کہ ایک ہزار کا ایڈیشن چار پانچ ہزار لوگ پڑھ لیتے ہوں گے اس طرح کس قسم کی تبدیلی آسکتی ہے سوائے اس کے کہ مڈل کلاس کے لوگ جو رسالہ یا کتاب خرید کر پڑھتے ہیں ان کے ذہن میں ممکن ہے کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہو۔ اونچے درجے کے لوگ جو اپنے ڈرائنگ روم کی ٹیبل پر رسالہ یا اخبار رکھنا گوارا نہیں کرتے اور اگر رسالے پڑھتے بھی ہیں تو NEWSWEEK اور TIMES پڑھتے ہیں کتابیں بھی انگریزی کی ہوتی ہیں اردو کی کتابوں کو پیچھے چھپا کر رکھتے ہیں ایسے لوگوں سے ہم کیا توقع رکھ سکتے ہیں۔

جہاں تک عوام کا تعلق ہے ہمارے ہاں خواندگی بارہ چودہ فیصد سے زیادہ نہیں ان میں سے دس فیصد کو اردو کی کتاب پڑھنا تو کیا دیکھنا بھی گوارا نہیں۔ باقی رہ گئے دو چار فیصد وہ مڈل اور لوئر مڈل کلاس کے لوگ ہیں جو کتاب خرید کر پڑھتے ہیں لیکن کتابیں بھی اتنی مہنگی ہو گئی ہیں کہ خریدنا مشکل ہو گیا ہے اس طرح بھلا ہم کیا انقلاب لائیں گے۔ جب تک تعلیم عام نہیں ہو گی اور عوام ہماری تحریر نہیں پڑھیں گے ہم ان کی سوچ پر کیسے اثر انداز ہوں گے۔

بیدار: انقلاب کی بات ہو رہی ہے نظریے کی بات ہو رہی ہے۔ اب تک تو کوئی ایسا مذہب یا نظریہ قائم نہیں ہوا تو دنیا کے ہر کونے اور ہر دور میں قابلِ قبول ہو لہٰذا وہ تخلیق جو کسی نظریے یا فلسفے پر مبنی ہو وہ اس نظریے یا فلسفے کی طرح عارضی ہو گی۔ اس حوالے سے آپ کا ترقی پسند تحریک سے متعلق

ہونا اور اس کے زیرِ اثر تخلیقات لکھنا اب آپ کو کیسا نظر آتا ہے؟

قاسمی: میں سمجھتا ہوں کہ نظریے کے بغیر تخلیقی ادب بالکل بے معنی ہو جاتا ہے دنیا کے عظیم شاہکار چاہے کسی بھی زبان میں لکھے گئے ہوں ان کے پس پردہ کوئی نہ کوئی نظریہ موجود ہے اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ نظریہ تخلیق ادب کے لیے مضر ہے اس لیے میں نظریے سے دست کش ہوتا ہوں تو یہ بھی ایک نظریہ ہے۔

بیدار: میں نظریے کے عارضی پن کی بات کر رہا تھا۔

قاسمی: میرا نظریہ انسان دوستی کا ہے اس میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ ہزار نظریے بدل جائیں ہزار عقیدے بدل جائیں انسان دوستی اور انسانی محبت کا نظریہ اپنی جگہ قائم ہے مساوات ہونی چاہیئے۔ انصاف ہونا چاہیئے اگر یہ سب چیزیں ہمیں مل بھی جائیں تب بھی انسان تو موجود ہوں گے اور انسان دوستی کی ضرورت ہوگی۔

سہیل: قاسمی صاحب! آپ کے خیال میں کیا نقاد کے لیے خود تخلیق کار ہونا ضروری ہے؟

قاسمی: اگر نقاد خود تخلیق کار ہو تو سونے پر سہاگے والی بات ہے لیکن بعض ایسے تنقید نگار بھی ہیں جو تنقید بھی تخلیقی کرتے ہیں جسے ہم تخلیقی تنقید کہہ سکتے ہیں وہ تحقیق جو تخلیق کے آس پاس ہوتی ہے جو ہمارے ہاں نقرے بازی کا سلسلہ چلا ہے اس سے وہ دور رہتے ہیں۔ وہ ہر نقطۂ نظر کو ہر فن پارے کو نہایت خوبصورتی سے جانچ تول کر پڑھتے ہیں ایسے نقادوں کے لیے ضروری نہیں کہ وہ شاعر یا افسانہ نگار ہوں۔

ویسے ہمارے ہاں بہت سے نقاد ایسے ہیں جنہوں نے شاعری کی کوشش کی اس میں ناکام ہوئے تو نقاد بن گئے لیکن ایسے نقاد بھی جو اعلیٰ تنقید لکھ رہے ہیں اگرچہ ان کی تعداد کم ہے تخلیقی تنقید سے آئندہ نسلیں سبق

حاصل کریں گی۔

اشفاق: قاسمی صاحب! آپ کے دامن پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ آپ بہت سی کتابوں کے ڈسٹ کور اور فلیپ لکھ دیتے ہیں اور سب کے لیے اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں آپ کا مقصد چاہیے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہو لیکن اردو کا عام قاری CONFUSE ہوجاتا ہے وہ یہ دیکھتا ہے کہ ایک گھٹیا شاعر کے لیے قاسمی صاحب نے اتنی اعلیٰ رائے قائم کی ہے اس سے اچھے اور بُرے ادب کی پہچان میں اُسے دقتیں پیش آتی ہیں۔ آپ کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟۔

قاسمی: آپ کا الزام بجا ہے مجھے تو بعض حلقوں میں فلیپ نگار کہا جاتا ہے۔ ایک بار میرے ایک عزیز دوست نے ایک کتاب کے اجرا کے وقت جبکہ صدارت میں کر رہا تھا کہا کہ اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کا فلیپ قاسمی صاحب نے نہیں لکھا۔ (سامعین میں قہقہے)

میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ میں دریا کے کنارے بیٹھا ہوں۔ چھاننی میرے ہاتھ میں ہے میں ریت کو چھان رہا ہوں جب سونے کے ذرات ملتے ہیں تو دوسروں کے سامنے پیش کر دیتا ہوں۔ پچھلے تیس برس سے فنون نکال رہا ہوں ایک سو سے زیادہ شاعر اور افسانہ نگار INTRODUCE کروا چکا ہوں جو اب ادبی دنیا میں مانے جاتے ہیں۔

میں جب FLAP لکھتا ہوں تو جھوٹ نہیں لکھتا۔ اگر کوئی نالائق قسم کا شاعر مجھے مجبور کر دے کہ میں FLAP لکھوں مثال کے طور پر ایک شاعر سے میں نے معذرت کی کہ میں لکھ نہیں سکتا کیونکہ مجھے آپ کا کلام پسند نہیں ہے اس نے کہا کہ اس کے باوجود کچھ لکھیں۔ چنانچہ میں نے لکھا کہ یہ وضعدار اور مستقل مزاج شاعر ہیں آج سے تیس سال پیشتر جیسی غزل لکھ رہے تھے آج بھی ویسی ہی لکھ رہے ہیں (سامعین میں قہقہے)

جب وہ تبصرہ چھپ گیا تو لوگوں نے اس سے کہا کہ یہ تم نے کیا حماقت کی۔ چنانچہ اگلے ایڈیشن میں اس نے وہ تبصرہ شامل نہیں کیا۔

نوٹ۔ (مجھے بہت افسوس ہے کہ TAPING کی خرابی کی وجہ سے پورا انٹرویو ریکارڈ نہ ہو سکا۔)

خالد سہیل